بنیاد، جلد۱۳، ۲۰۲۲ء

عزیز ابن الحسن*

پاسکل کی الٰہیاتی وجودیت اور ہمارا تہذیبی آشوب

Pascal's Theological Existentialism and Our Civilizational Turmoil

Abstract:

This paper discusses Pascal's concepts of God, human misery, fear, and other existentialist themes. His intellectual journey and its outcomes are thought to have been very significant in understanding and combating major existential problems of our age, namely skepticism, and atheism. In this context, the global civilizational turmoil manifesting in multiple forms like anguish, depression, melancholy, grief, spiritual barrenness, confusion, pain, fear, horrible existential nihilism, and being cultural uprootedness found in contemporary discourse can learn a lot from Pascal's theological existentialism. The author holds that a fresh debate in Urdu needs to be initiated around the theological existentialism.

Keywords: Existentialism, irrationalism, skepticism, divine grace, leap of faith, civilizational malaise, Urdu.

پروین شاکر نے بڑے مزے کا شعر کہہ رکھا ہے۔

ہندی روایت کی پتی ورتا سہاگن کے سے پیار والی پریمیکا اپنے پریتم کو بڑی اٹھلاہٹ سے کہتی ہے:

اس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی
جیتوں تو تجھے پاؤں، ہاروں تو پیا تیری

یعنی ہار ہو یا جیت نقصان بہر حال نہیں ہونے کا؛ مطلوب دونوں صورتوں میں حاصل ہے!

سترہویں صدی کے معروف فرانسیسی ریاضی دان فلسفی اور مسیحی متکلم پاسکل (Blaise Pascal۔۱۶۲۳ء-۱۶۶۲ء) نے بھی ایک کھیل کھیلنے اور بازی لگانے کی پیشکش کی تھی جسے "پاسکل بازی" (Pascal's Wager) کہتے ہیں۔

بعد از مرگ چھپنے والی اپنی معروف کتاب *Pensées* (خواطر)[1] میں اس نے عمانوئیل کانٹ (Immanuel

Kant۔ ۱۷۲۴ء-۱۸۰۴ء) سے کہیں پہلے بڑی قطعیت سے واضح کیا تھا کہ خدا ہے یا خدا نہیں ہے، عقل اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ خدا کے ہونے یا نہ ہونے پر ازل سے جوئے کی ایک بازی لگی ہوئی ہے۔ آپ نے اس میں شریک ضرور ہونا ہے۔ خواہ ہار پر بازی لگائیں یا جیت پر، آپ کو ان دونوں میں سے ایک کام ضرور کرنا پڑے گا۔ سب سے بڑھ کر ہار جیت کے امکانات بھی برابر ہوں تو سمجھ داری کا تقاضا کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ:

۱۔ آپ کو شرط ضرور لگانی چاہیے۔ ویسے بھی یہ شرط آپ کو لگانی ہی ہے کہ ہارنے کی صورت میں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ آپ مر کے مٹی ہو جائیں گے یعنی صرف جان کا ہی زیاں ہے جو ہر صورت میں ہونا ہے۔

۲۔ جیتنے کی صورت میں آپ کو لاانتہا فائدہ ہے اس لیے آپ لازماً ظفر مندی کے لیے شرط لگائیں گے۔ تو آیئے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے شرط لگا دیں کہ "خدا موجود ہے"[۲]۔

پاسکل بازی اگرچہ پاسکل کے نام سے مشہور ہے اور اس کی تعبیر ریاضیاتی اغلبیت(Probability)، فیصلہ (Decision)، نتائجیت(Pragmatism) اور ارادیت(Voluntarism) کے نظریوں کی روشنی میں کی جاتی رہی ہے۔ مغربی فکر میں اس پاسکل بازی کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ پاسکل بازی پر اعتراض کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کسی بازی(wager) کی اغلبیت منطقی طور پر اعتقاد کے بعد ہے، اس کا مطلب یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے خدا پر یقین کیا اور اس کے فضل کو قبول کیا ہے ان کی بازی غیر معقول بالکل نہیں۔ کیوں؟ کیوں کہ ابدی نجات کے ذریعے کے طور پر ایمان کی اہمیت یا قدر کی نسبتاً غیر معقولیت کی تلافی کرتی ہے[۳]۔

عقل کی عدم قطعیت، نارسائی اور تشکیک کی وجہ سے بعد کے لوگوں نے پاسکل کا شمار لاعقلیت(Irrationalism) اور وجودیت(Existentialism) کے فلسفیانہ اور مذہبی بنیاد گزاروں میں کیا ہے۔ انسان کو اس کی مرضی اور خواہش کے بغیر کائنات کے لامتناہیت کے ہولناک ریگزاروں میں پھینک دیا جانا پاسکل کو گویا بے معنویت کی دہشت میں مبتلا کرتا رہا۔ پاسکل کی بازی کی طرح ایک اور شے، جس کی بنا پر وہ ابھی نصف صدی قبل تک کیر کے گور(Soren Aabye Kierkegaard۔ ۱۸۱۳ء-۱۸۵۵ء) جیسے وجودی فلسفیوں کے باوا آدم کے طور پر زیر بحث آتا رہا ہے، وہ ہے پاسکل کی دہشت(Pascal's Terror)۔ خواطر میں ہمیں جگہ جگہ اس کے ایسے نوحے سننے کو ملتے ہیں جن کی بازگشت بعد میں وجودیوں کے ہاں بھی سنائی دیتی ہے:

جب میں قبل و بعد کی ابدیت کی نگلی ہوئی اپنی زندگی کے قلیل دورانیے پر غور کرتا ہوں کہ یہ تو تھوڑی سی جگہ ہے جس کو میں بھرتا اور دیکھ سکتا ہوں، یہ اس لامحدود بے پایاں مکانی حدود میں گھری ہوئی ہے جس سے میں قطعی لاعلم ہوں، اور جو مجھے نہیں جانتی، تو میں دہشت سے بھر جاتا ہوں اور وہاں کی بجائے یہاں ہونے پر حیران ہوتا ہوں

کیوں کہ وہاں کی بجائے یہاں ہونے اور تب کی بجائے اب ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ مجھے یہاں کس نے لا پھینکا ہے؟ کس کے حکم اور ہدایت پر مجھے یہ جگہ اور وقت تفویض کیا گیا ہے؟ ان لا محدود مکانوں کی ابدی خاموشی مجھے خوفزدہ کر دیتی ہے[۴]۔

جب میں انسان کے اندھے پن اور بدبختی کو دیکھتا ہوں، جب میں کائنات کی خاموش پہنائیوں کو، اندھیاروں میں بھٹکتے انسان کو کائنات کے اس کونے میں سراسیمہ و تنہا گم صُم دیکھتا ہوں، یہ جانے بغیر کہ اسے کس نے وہاں پھینک دیا ہے، وہ کیا کرنے آیا ہے اور موت کے وقت اس کا کیا بنے گا، تو میں یہ سب کچھ جاننے سے عاجز و لاچار، ایک ایسے آدمی کی طرح جسے نیند میں اٹھا کر ایک دہشت ناک بنجر جزیرے میں چھوڑ دیا گیا، جو جاگنے پر فرار کا کوئی رستہ نہ پا کر دھک سے رہ جائے، میں اس طور خود کو ایک دہشت میں مبتلا پاتا ہوں۔ میں اس پر حیرت زدہ ہوں کہ اس حالت میں بھی یہ آشفتہ و خاک بسر لوگ اتھاہ مایوسیوں کا شکار کیوں نہیں ہوتے۔ میں اپنے ارد گرد دوسرے افراد کو جب اسی طرح کی فطرت سے دوچار پاتا ہوں تو میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا وہ اس ہولناکی سے مجھ سے بہتر آگاہ ہیں؟ وہ مجھے بتاتے ہیں کہ نہیں، وہ نہیں ہیں۔ اس پر بھی یہ بدبخت و حواس باختہ مخلوق، اپنے ارد گرد جب کچھ دل خوش کن چیزیں دیکھتی ہے تو خوشی خوشی ان سے دل لگا لیتی ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں خود کو ان سے منسلک نہیں کر پایا ہوں، اور یہ دیکھتے ہوئے کہ کس شدت سے یوں لگتا ہے کہ جو کچھ مجھے نظر آتا ہے اس کے علاوہ بھی کچھ ہے تو، میں جانچ پڑتال کرنے لگتا ہوں کہ آیا خدا نے اپنی ذات کی کوئی علامت نہیں چھوڑی![۵]

کچھ ایسی ہی باتوں کے پیش نظر ولیم بیرٹ (William Christopher Barrett۔۱۹۱۳ء-۱۹۹۲ء) کا کہنا ہے کہ سترہویں صدی میں پاسکل نے گویا ہماری آج کی دنیا کا نقشہ کھینچ دیا ہے[۶]۔ انسانی ارادے کی آزادی اور ذمہ داری کی یہی وہ کیفیت ہے جسے Existential angst, Existential dread, Anxiety or Anguish وغیرہ کہا جاتا ہے جو کیرکے گور جیسے مذہبی وجودیوں اور کامیو (Albert Camus۔۱۹۱۳ء-۱۹۶۰ء) جیسے غیر مذہبی وجودی لایعنیت پسندوں کا مشترک مسئلہ ہے[۷]۔ جب ہم پاسکل کو اس طرح کی کیفیات میں پاتے ہیں کہ: ''ان لاتعداد مقامات کی ابدی خاموشی مجھ کو خوف سے بھر دیتی ہے[۸]۔'' تو بے ساختہ اقبال (Muhammad Iqbal۔۱۸۷۷ء-۱۹۳۸ء) کی نظم ''لالۂ صحرا'' کے اشعار یاد آتے ہیں[۹]۔

پاسکل اور بعد کے غیر مذہبی وجودیوں میں فرق یہ تھا کہ وہ پاسکل کی طرح ''ایمانی زقند'' کو قبول نہیں کر سکتے۔ وہ البرٹ کامیو کی طرح اسے ''فلسفیانہ خودکشی'' سمجھتے ہیں۔ غیر مذہبی وجودیوں کو یہ فلسفیانہ خودکشی قبول نہیں ہوتی، چاہے اس کے نتیجے میں لایعنیت ہی کیوں نہ قبول کرنی پڑے۔ حالانکہ کامیو کو خود بھی یہ تسلیم ہے کہ:

ایک ایسا امر واقعہ موجود ہے جو بالکل اخلاقی نظر آتا ہے: یعنی، آدمی ہمیشہ اپنی سچائیوں کا شکار رہتا ہے۔ ایک بار

جب اس نے ان کو تسلیم کر لیا تو وہ خود کو ان سے رہائی نہیں دلا سکتا۔ اسے اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ وہ شخص جو لایعنیت (ابسرڈ) سے آگاہ ہو گیا (سمجھو) وہ ہمیشہ کے لیے اس میں بندھ گیا۔ امید سے خالی اور ایسا ہونے کا شعور رکھنے والا آدمی مستقبل سے تعلق ختم کر چکا ہوتا ہے۔ یہ فطری بات ہے۔ لیکن یہ بھی عین فطری ہے کہ اسے اس کائنات سے فرار کی کوشش کرنی چاہیئے جس کا وہ خالق ہے۔ تمام سابق الذکر معاملات کی اہمیت اسی قولِ محال کی وجہ سے ہے۔ عقل پرستی کی تنقید سے شروع ہونے والے بعض مخصوص افراد نے اس لایعنیت کے ماحول کو تسلیم کر لیا ہے[10]۔

آٹھ سال کی عمر میں ماں کی شفقت سے محروم ہونے، عمر کا بڑا حصہ بیماریوں میں گزارنے، اور چہل سال عمر عزیز کو نہ پہنچنے سے پہلے مر جانے والا پاسکل ایک مذہبی گھرانے کا فرد اور پیرس کی اعلیٰ فیشن ایبل سوسائٹی میں رہنے والا تھا۔ ایک مایہ ناز ریاضی دان و ماہر طبیعیات کے طور پر پاسکل عقل کی اہمیت کا بے طرح قائل تھا مگر اس نے محسوس کیا کہ خالص عقل اور محض منطق خدا کے وجود کا اثبات نہیں کر سکتی۔ پاسکل کا اصل کارنامہ یہ نہیں کہ اس نے عقل کی نارسائی کو مبرہن کیا بلکہ اس کا کمال یہ تھا کہ اس نے عقل کو ایمان کی تقویت کے لیے کھولا اور اس میں صَرف کر کے دکھایا۔ وہ اقبال کی طرح عقل کے غلام دل کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔

خواطر (Pensées) پر ٹی ایس ایلیٹ (Thomas Stearns Eliot۔۱۸۸۸ء-۱۹۶۵ء) نے اس کے ۱۹۵۸ء کے ایڈیشن جو مقدمہ لکھا ہے وہ پاسکل اور اس کے ذہن کے ساتھ ساتھ ہمارے زمانوں کے الحاد اور تشکیک کی تشخیص کے لیے بھی بہت مفید ہے[11]۔ خواطر کے عنوان سے خود نوشت روحانی سوانح کی طرح کے یہ اوراق دراصل قلم برداشتہ لکھے گئے شذرات تھے جو پاسکل نے مکمل کیے بغیر چھوڑ دیے۔ سانت بیو (Charles Augustin Sainte-Beuve۔۱۸۰۴ء-۱۸۶۹ء) کے الفاظ میں یہ کتاب سیمنٹ کے بغیر ایک دوسرے کے اوپر رکھے گئے پتھروں کے مینار کی طرح ہے۔ ابتدائی برسوں میں پاسکل کا حافظہ بہت تیز تھا جو بعد میں بیماریوں کے سبب کمزور ہو گیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید وہ یہ شذرات کبھی ضبطِ تحریر میں نہ لاتا۔ موجودہ صورت میں بھی یہ کتاب فرانسیسی ادب اور مذہبی گیان دھیان کی تاریخ میں ایک شاہکار شے ہے[12]۔

پندرہویں صدی کے متشکک فرانسیسی مفکر اور ادیب مونتین (Michel de Montaigne۔۱۵۳۳ء-۱۵۹۲ء) کا مطالعہ پاسکل نے اس کا ردّ لکھنے کے لیے شروع کیا تھا۔ مگر ٹی ایس ایلیٹ نے مونتین کی حیرت انگیز و مہیب زود اثری کے بارے میں لکھا ہے کہ جب تک کوئی آدمی اسے اتنا سمجھ لے کہ خود کو اس پر حملہ کرنے کے قابل تصور کرنے لگے وہ، اس سے بہت پہلے ہی، خود اس کے زیر اثر آ چکا ہوتا ہے کیوں کہ مونتین تو ایک دھند، ایک گیس، ایک سیال عنصر ہے، اور گھات لگا کر حملہ کرنے والا قاتل ہے۔ وہ استدلال نہیں کرتا، نفوذ کرتا ہے، غیر محسوس طور پر آپ کے اندر اترتا چلا جاتا ہے۔ یا اگر وہ استدلال کرتا ہے، تب بھی آپ کو

ہوشیار رہنا پڑتا ہے۔ اس کے پاس آپ کو منوانے کے لیے دلیل کے علاوہ بھی دیگر بہت سی خطرناک گھاتیں ہوتی ہیں۔ اگر آپ گزشتہ تین صدیوں کے فرانسیسی افکار کی روش کو سمجھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے مونتین کو جاننا اور بھی ضروری ہے"[۱۳]۔

مونتینی تشکیک کی یہ نفوذی تاثیر پاسکل پر بھی اثرات چھوڑے بغیر نہ رہی تھی۔ مونتین اگر کوئی عام سا متشکک ہوتا، یا حتیٰ کہ ہر دور کے سب سے بڑے متشکک والٹیئر (Voltaire۔ ۱۶۹۴ء-۱۷۷۸ء) کی طرح کا آدمی ہوتا، تب بھی پاسکل کا اس سے متاثر ہو جانا، اس کے لیے باعثِ خفت ہوتا لیکن مونتین کا فطری جوہر والٹیئر سے بھی بڑا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ کبھی پاسکل کو متاثر نہ کر سکتا۔ اس تاثر ریزی میں پاسکل اور مونتین کی تشکیکی نوعیت کے اشتراک کا بھی بہت بڑا حصہ تھا۔ اس پس منظر میں پاسکل کا مونتین سے متاثر ہو جانا اتنا اہم نہیں تھا جتنا اس آسیب کے اثر سے سلامتی سے نکل آنا۔

پاسکل کو انسانی مجبوریوں کا شدید احساس تھا۔ اس بارے میں ہر قسم کی، اور بعض اوقات اپنی بھی، خوش فہمیوں کو مجروح کرتے اس کے تجزیوں کی بنا پر بعضوں نے اسے منکر ایمان / بے اعتقاد بھی کہنے کی کوشش کی ہے، جس کی مایوسی نے اس کے لیے حقیقت، اور ایک آزاد انسان کی خواہ مخواہ کی عبادت سے حاصل ہونے والی سورمائی طمانیت کو خود اس کے لیے ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ تاہم اس کی مایوسیوں کے اسباب شخصی نہیں تھے بلکہ ایک صاحبِ دانش روح کی پر تجسس کش مکش کے معروضی حاصلات تھے۔ جیسے خشک سالی اور سیاہ رات کی سی انقباضی کیفیات ہوں جو ایک سالک کو اپنے سفر کے دوران میں پیش آتی ہیں۔ ایسے حالات جو اگر کسی ناخالص اور کمزور روح کو پیش آ جائیں تو خوفناک انجام پر منتج ہوں مگر پاسکل جیسی بڑی روح اس بحران سے با آسانی نکل گئی اور یہ بحران اس کے لیے سکینتِ ایمان کی تمہید بن گیا۔

اس سلسلے کے کچھ مسائل یہ تھے:

مسیحی علم کلام کے مطابق فرد کی شخصی قابلیت، انسان کے آزاد ارادے کے فطری اعمال اور فضل خداوندی (جس کے بارے میں نہیں معلوم کہ وہ کب اور کیسے روبہ عمل ہوتا ہے) مل کر اس کی نجات کو ممکن بناتے ہیں۔ گو مختلف ماہرین نے اس مسئلے پر بہت سا کلام کیا ہے مگر انسان کے آزاد ارادے اور فضل خداوندی کا یہ پر اسرار تعلق ادراک میں تو کچھ آتا ہے مگر اس گتھی کو حتمی طور پر سلجھانا شاید ممکن نہیں۔ جیسا کہ ہوا کرتا ہے، دیگر بہت سے عقائدی معاملات کی طرح "ارادے" اور "فضل" میں سے کسی ایک طرف غیر متوازن جھکاؤ بالعموم بدعت کی کسی نہ کسی صورت پر منتج ہوا کرتا ہے، اس بحث میں قدریہ (Pelagians) اگر انسانی اختیار کی برتری اور فضل کی تخفیف کے قائل ہو گئے تو دوسری طرف Calvinists نے ہبوط آدم کے ازلی گناہ کے تصور کے زیر اثر ہر قسم کے انسانی اختیار کا انکار کر کے سب کچھ خدائی فضل کے سپرد کر دیا اور جبریہ کی فہرست میں شامل ہو گئے تھے۔

پاسکل کا مسیحی فرقے Jansenism سے تعلق تھا، وہ اس تنازع میں سینٹ آگسٹائن (Saint Augustine۔ ۳۵۴ء-

۱۶۳۰ء) کی ہم نوائی میں کچھ "فضل" والے مؤقف کا حامی تھا، مگر بدعت اور گمراہی کی کسی صورت کو بھی حتمی نہیں کہا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ نئے انڈے بچے دیتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ عقیدہ کہ نیک اعمال کرنے اور زاہدانہ زندگی گزارنے والوں کو نجات کے حوالے سے کسی "بیمار تشویش" کا شکار نہیں ہونا چاہیے، "قدریت" ہی کی ایک صورت ہے، جو "فضل" کی انکاری اور اصلاً "اختیاری اعمال" ہی کو حتمی نجات کا ضامن سمجھتی ہے۔ اس کے برعکس یہ آوازیں بھی اٹھتی رہتی ہیں کہ نیکی و اخلاقی زندگی گزارنے کے تمام مذہبی تصورات اگر ختم ہو جائیں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو ازل سے نیک طبیعت لے کے آئیں گے وہ نیک اعمال ہی کریں گے اور جو بدطینت ہوں گے وہ لامحالہ بد اعمال ہی ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ "جبریت" ہی کی ایک صورت ہے کیونکہ کسی کی نیک طینتی یا بدفطرتی اسی طرح غیر یقینی اور غیر اختیاری شے ہے جیسے فضل کا تصور۔ یہ مخمصہ پاسکل کے ساتھ بھی رہا! وہ سمجھتا ہے کہ ہبوط آدم کی وجہ سے انسانی فطرت میں جو ایک جوہری گراوٹ آ گئی ہے اس سے نکلنے کا روزن جو انسان کے لیے فضل کی صورت میں کھولا گیا ہے وہ اصل میں انسان کے لیے خدا کا ایک انعام ہے[۱۴]۔ مگر اس مسئلے پر ہم آگے کلام کریں گے۔

جینسنی مسلک (Jansenism) کا ایک مخلص پیروکار ہونے کی وجہ سے پاسکل کا رجحان اسی طرف ہونا چاہیے تھا اور وہ تھا بھی، مگر انسانی بے چارگیوں اور مجبوریوں کا جیسا احساس پاسکل کو تھا، وہ محض ایک فلسفی اور ریاضی دان ہونے کی وجہ سے ممکن نہ تھا، بلکہ اس کے اندر ایک راہب اور ایک فنکار کی روح بھی تھی جس کی بدولت وہ اپنے خواطر میں انسانی بوالعجبیوں کی کچھ پر جلال تصویریں پیش کرنے کے قابل ہوا۔ اس کی سطح اور فکر و دانش کے سلگتے احساسات کی قوت والا آدمی بھلا عام انسان کے حالات و مشاغل، خیالات اور محرکات، خود رائی، خود پسندی، زعم و عُجب، شیخی خوری، اس کی بے ایمانی، خود فریبی، دھوکہ دہی پر مبنی جذبات کی فریب کاری اور حقیقی خواہشات کی پستی جیسے تضادات سے کیسے صرف نظر کر سکتا تھا؟ اس نے انھیں بالکل نظر انداز نہیں کیا بلکہ ایک فلسفی و سائنسدان سے زیادہ ایک صاحبِ اسلوب ادیب کی سی جلالت شان کے ساتھ ان چیزوں کا اظہار کیا۔ خواطر کے غالباً ایسے ہی مقامات ہیں جو پاسکل کو مونتین کے قریب کرتے ہیں اور جن کی وجہ سے اس کے وجودیت پسند (Existentialist) ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ خود پسند مگر انانیتی شکستوں سے چُور انسان کے لیے اس نے "فضل" کی کھڑکی کھول کر اس کی نجات کا امکان بحال کیا تھا۔

ذرا دیکھیے تو "خدا سے منقطع انسان کے مصائب" پر غور و فکر نے پاسکل کے اندر کس آسانی سے روحانی گھمنڈ کی معصیت کو تقویت دی ہو گی مگر پھر کس مضبوطی سے اس نے انکسار قائم رکھا۔ اس روحانی کاوش اور کش مکش کے دوران میں اس نے اگرچہ اتنی ہی طاقت صرف کی جتنی وہ اپنے سائنسی سرگرمیوں میں کیا کرتا تھا لیکن اس کتاب میں وہ کہیں یہ کہتا محسوس نہیں ہوتا کہ دیکھو میں ایک سائنس دان ہوں۔ میں ایسے روحانی اسرار سے واقف ہوں جو تم پر کبھی نہیں کھل سکتے، میں سائنس کے

راستے ایمان کی طرف لوٹا ہوں، لہٰذا تم لوگ جو کہ کبھی سائنس میں اتنا رسوخ حاصل نہیں کر سکتے، مجھے دیکھ کر تمھیں بھی ایمان لے آنا چاہیے[۱۵]۔

پاسکل چوں کہ ان معاملات کی نزاکت سے پوری طرح آگاہ تھا اس لیے اس نے اپنی سند اور تحکم (اتھارٹی) کو بالکل استعمال نہیں کیا بلکہ اس نے خواطر کے پہلے باب "Thoughts on Mind and on Style" میں ہی جیومیٹریائی / ریاضیاتی منطقی ذہن اور وجدانی / عملی ذہن کے طریقِ کار کے فرق سے بات سمجھائی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ریاضیاتی ذہن (اس میں عقل و منطق کو شامل سمجھیے) کے اصول بالکل واضح ہوتے ہیں مگر تجریدی انداز ہونے کی وجہ سے اور روزمرہ استعمال میں نہ ہونے کے سبب ان کی طرف توجہ مرکوز کرنے میں مشکل ہوتی ہے۔ اگرچہ ذرا سی محنت سے یہ سمجھ میں بھی آجاتے ہیں تاہم تیکنیکی اور فنی ہونے کی وجہ سے یہ ہر ایک کی دل چسپی کی شے نہیں ہوتے۔ اس کی برعکس وجدانی عملی یا لطیف ذہن (اس میں دل کو شامل سمجھیے) کے اصول روزمرہ سماجی زندگی میں استعمال ہونے والے ہوتے ہیں، آنکھ کے سامنے ہوتے ہیں، بس انھیں دیکھنے والی صحت مند اور صالح آنکھ چاہیے۔ مگر چوں کہ یہ اصول نہایت کثیر تعداد میں اور اتنے ہی لطیف، نازک اور پھیلے ہوئے ہوتے ہیں کہ اس کثرت اور لطافت کے سبب ہی ان کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کا امکان رہتا ہے، لہٰذا ان اصولوں کو بکار لانے کے لیے ایک طرف نہایت ہوشیار آنکھ ضروری ہے تاکہ کوئی جزو نظر انداز نہ ہو اور دوسری طرف ایک دراک ذہن بھی چاہیے تاکہ منطقی مغالطوں کے پیدا کردہ غلط نتائج تک پہنچنے سے بچا جاسکے۔ یہ گویا جز در جز شے کو دیکھتے ہوئے اور پورے آفاق کو بیک آن و بیک نظر گرفت میں لانے کا فن ہے۔ تمام ریاضیاتی ذہن وجدانی و عملی لطافت کے حامل ہوسکتے تھے اگر ان کی نظر درست ہوتی، کیوں کہ وہ اپنے جانے بوجھے اصولوں کی بہ دولت غلط استدلال نہیں کیا کرتے۔ اسی طرح تمام وجدانی ذہن ریاضیاتی ہوسکتے تھے بہ شرطیہ کہ وہ ریاضی کے مجرد اصولوں کو کام میں لاسکتے جن کے کہ وہ عادی نہیں ہوتے۔ مسئلہ یہ ہے کہ بعض وجدانی ذہن ریاضی کے مجرد اصولوں کو کام میں لانے کے اہل نہیں ہوتے اور ریاضیاتی ذہن بالکل سامنے کی چیزوں کو تب تک نہیں دیکھ پاتے جب تک ریاضیاتی مساواتوں میں ان کا تجزیہ نہ کرلیں۔ وجدانی و عملی ذہن ایسے لطیف ارتسامات کو محسوس کرلیتے ہیں جن کی وضاحت مشکل اور ثبوت مشکل تر ہوتا ہے۔ مگر ریاضیاتی و منطقی ذہن کے لوگ عام روزمرہ کے محسوساتی وجدانی معاملات کو بھی ریاضیاتی تجرید میں ڈھال کر انھیں مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔

عقل کی دو اقسام ہیں: ایک قسم وہ جو نہایت صحت کے ساتھ دیے گئے مقدمات کے نتائج کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ یہی صحیح (Precise) عقل ہے۔ دوسری وہ جو بہت سارے مقدمات کو ایک دوسرے میں مدغم کیے بغیر فہم کی گرفت میں لے آتی ہے، یہ ریاضیاتی عقل ہے۔ ایک میں قوت اور قطعیت ہوتی ہے تو دوسری میں فہم اور سوجھ بوجھ ہے۔ ایک، دوسرے کے بغیر

موجود ہو سکتی ہے۔ عقل مضبوط اور تنگ ہو سکتی ہے، اور یہ جامع اور کمزور بھی ہو سکتی ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ کند ذہن لوگ نہ وجدانی ہوتے ہیں نہ ریاضیاتی[۱۶]۔

پاسکل کے نزدیک غیر ریاضیاتی، غیر عقلی اور غیر تجزیاتی ہونے کے بجائے غیر وجدانی اور احساسات سے عاری ہونا زیادہ بڑی ناکامی ہے۔ اس سارے پس منظر میں وجدانی ذہن کی مثال مونتین ہے جو تجریدات کے بجائے ٹھوس سماجی حقائق و انسانی مسائل پر نظر رکھتا ہے اور زندگی کی بوالعجبیوں کو سمجھتا ہے جب کہ ریاضیاتی ذہن کا نمونہ ڈیکارٹ (René Descartes ۱۵۹۶ء-۱۶۵۰) ہے جو صرف اس وقت استدلال کر سکتا ہے جب اس کے سامنے واضح تعریفات، مفروضات اور اصول موضوعہ ہوں۔ اس کا ذہن ڈیکارٹ کی طرح سائنسی مگر جذبہ مونتین کی طرح التہابی تھا۔ ذہن اور جذبے کی اسی ہم آہنگی کی وجہ سے وہ مونتین کے برعکس ریاضیاتی سرگرمیوں میں بھی بے مثال تھا اور خداشناسی میں بھی ڈیکارٹ کی نسبت کہیں زیادہ بااعتبار ہوا!

جیسا کہ اشارہ کیا گیا پاسکل کے زمانے کے مسیحی علم کلام کا ایک اہم مسئلہ جبر و قدر کے مابین توازن کی تلاش تھا۔ جبریت اور قدریت کے بین بین اس نے جو راہ نکالی وہ یہ تھی کہ ہبوطِ آدم کے لازمی مضمرات کے طور پر انسانی نہاد میں جو گراوٹ پیدا ہو گئی ہے، وہ صرف و محض اپنی استعداد کی بل بوتے پر اخروی نجات کے لیے ناکافی ہے، اس لیے خدا کی مشیت میں انسان کے لیے جب کچھ اچھا کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہ اپنے فضل سے انسان کے لیے نیکی کی راہ ہموار کر دیتا ہے جس کے بعد انسان کے گویا "اپنے" عمل سے اس کے لیے راہِ نجات ہموار ہوتی جاتی ہے۔ آدم اور اولادِ آدم آزاد اختیار کے مالک ہیں۔ آدم مائل بہ نیکی تھے لیکن اولادِ آدم مائل بہ شر رہتی ہے۔ مگر اس کے باوجود انسان کی نجات کیسے ممکن ہے اس کے لیے پاسکل کے قلمی نام سے لکھے گئے اٹھارہ خطوط کے مجموعے *The Provincial Letters* کے خط نمبر ۱۸ کو پڑھنا چاہیے جو سینٹ آگسٹائن کے تصور جبر اور فضل کا بہترین بیان ہے:

> انسان، اپنی فطرت کے مطابق، ہمیشہ گناہ کرنے اور فضل کے خلاف مزاحمت کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور اپنے طبیعی فساد کے وقت سے ہی اس کے اندر شہوت و مستی ہوتی ہے جو مزاحمت کی اس طاقت کو لامحدود حد تک بڑھا دیتی ہے۔ اس کے باوجود جب خدا کی رضا ہو کہ اس کی رحمت انسان کو چھوئے تو انسان کی فطری آزادی کو متاثر کیے بغیر خدا کی قدرت کاملہ اسے وہ کرنے دیتی ہے جو وہ چاہے اور جس طرح وہ عمل کرے۔۔۔ یہ ہے وہ پر حکمت طریقہ جس سے خدا انسان کی آزادئ عمل پر وجوب مسلط کیے بغیر اسے راہ دیتا ہے اور انسانی اختیار، جس میں خدائی فضل کی بالقوہ مزاحمت کرنے کی خو پائی جاتی ہے مگر وہ ہمیشہ ایسا نہیں کرنا چاہتا، اپنی آزادی سے، بنا چوکے، خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ جبر، تقدیر، انسانی اختیار، خواہش اور فضل خداوندی میں تطبیق کا یہ وہ اسلوب ہے جس کے مماثل آرا ہمیں پاسکل سے قبل اور بعد کے مسلمان صوفیہ میں بھی مل سکتی ہیں[۱۷]۔

ایلیٹ کا کہنا ہے کہ پاسکل دنیاداروں میں زاہد اور زاہدوں میں ایک دنیادار آدمی تھا۔ اسے دنیاداری کا پورا علم تھا اور اس کے اندر ترک دنیا کے لیے ہمہ وقت جوش و جذبہ بھی کار فرما تھا۔ اس کی ذات میں یہ دونوں چیزیں—زہد اور دنیاداری۔ ایک کلیت کی صورت اکٹھا ہو کر اکائی میں ڈھل گئی تھیں۔ اس کا طریقِ کار ایک ایسے صاحب ایمان کا منہاج تھا جو عقل کو کسی طور پر معطل نہیں کرتا بلکہ اسے ایمان کی خدمت میں مطیع کر کے رکھتا ہے۔ ایک صاحب ایمان اور ایک ملحد میں ایک بنیادی فرق ہوتا ہے۔ ایک کامل صاحب ایمان آدمی بیرونی کائنات اور باطن کی اخلاقی دنیا کی تعبیر کسی غیر مذہبی نقطہ نظر سے کر ہی نہیں سکتا۔ اور یہ سب وہ عقل کی پوری روشنی میں کرتا ہے وہ عقل کو معطل کر کے زندہ نہیں رہتا بلکہ زندگی اور کائنات کے ہر پہلو کی تعبیر عقل کی پوری معاونت کے ساتھ کرتا ہے۔ مگر ایک ملحد کے لیے یہ طریقہ کار خاصا غیر تسلی بخش ہوتا ہے۔ اسے جس وقت کائنات کی جو بھی تعبیر مطمئن کرے وہ اس کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ کائنات کی بے نظمی اسے پریشان نہیں کرتی۔ اسے کچھ اقدار کی پابندی بھی نہیں کرنی پڑتی لہٰذا ایں اعتبار تو وہ سکھی رہتا ہے مگر من کھنڈر کی ہولناکیاں اس کے لیے جب ناقابل برداشت ہو جائیں تو اس کا آخری سہارا خودکشی کے سوا کچھ نہیں ہوتا جبکہ پاسکل جیسے ریاضی دان کا طریقہ ایک صاحبِ ایمان کی سکینت مآبی اور ایمان کے آگے عقل کی اطاعت گزاری کا راستہ ہے۔ اس کے برعکس تشکلکین و ملحدین کا جو طریقہ ہے اس کی نمائندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے والٹیئر نے کر دی ہے۔ اس نے پاسکل کو رڈ کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا اس نے ایمان کو جھٹلانے کا منہاج ہمیشہ کے لیے متعین کر دیا ہے۔ ان کے بعد آنے والوں کو ان دونوں میں سے کسی ایک طریقے کا انتخاب کرنا ہوگا: بس پاسکل یا والٹیئر! پاسکل ان لکھنے والوں میں سے ہے جسے ہر نسل کو نئے انداز سے پڑھنا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ تبدیل ہوتا ہے بلکہ یہ کہ ہم تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں کہ اس کے بارے میں ہمارا علم تبدیل ہوتا ہے بلکہ یہ کہ دنیا تبدیل ہوتی ہے اور دنیا کے بارے میں ہمارے روّیے بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وہ شے ہے جو الحاد و ایمان کی روز افزوں کشمکش میں پاسکل کو آج بھی ہمارے لیے بامعنی بناتی ہے"[۱۸]۔

اپنے ہم عصر پاسکل کی طرح ڈیکارٹ بھی خدا کا قائل تھا اور اس کی طرح یہ بھی سمجھتا تھا کہ خدا کے وجود کو عقلی استدلال سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ مگر پاسکل کے نزدیک خدا مقصود بالغیر نہیں بلکہ مقصود بالذات تھا جبکہ ڈیکارٹ کے بارے میں پاسکل کا خیال تھا کہ وہ خدا کو اس طرح نہیں مانتا تھا۔ اسی لیے اس نے خواطر میں ڈیکارٹ کے بارے میں جو چند ایک جملے ہیں ان میں اس کی کمزور ترین رگ پر انگلی رکھ دی ہے:

> وہ جنھوں نے سائنس کو گہرے مطالعے کا موضوع بنایا ان میں سے ایک ڈیکارٹ ہے، ان کا رڈ ضروری ہے۔ میں ڈیکارٹ کو معاف نہیں کر سکتا۔ اپنے سارے فلسفے میں تو وہ خدا کے بغیر ہی کام چلانے پر راضی رہا مگر صرف کائنات کو حرکت میں لانے کے لیے اسے خدائی ہاتھ کو جنبش کی اجازت دینا پڑی۔ اس سے آگے اسے خدا کی مزید کوئی

ضرورت نہیں ہے[۱۹]۔

اسی طرح کانٹ کا بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے۔ اس کے نزدیک بھی عقل سے خدا کا وجود ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن اخلاقی زندگی کو بنیاد مہیا کرنے کے لیے خدا کے تصور کو وہ ضروری خیال کرتا ہے[۲۰]۔ گویا خدا کو صرف اس لیے مان لینا چاہیے کہ اس کی بدولت پاکیزہ اخلاقی زندگی بسر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسے ہی خیالات دستوفسکی کے کردار ایوان کرامازوف کی عقلیت پسندی بھی اسے سجھاتی ہے کہ "اگر خدا نہ ہوتا تو اسے ایجاد کرنا پڑتا" کیوں کہ "باغی ہو کر جینا مشکل ہے"۔

ڈیکارٹ کے بارے میں مذکورہ بالا سخت ترین رائے دینے کے بعد اس سے اگلے پیرے میں ہی پاسکل نے ایسے سادہ لوحی سے باتیں کرنے والوں کا مضحکہ لنگڑے اور احمق کی تمثیل سے اڑایا ہے:

> آخر ایسا کیوں ہے کہ ایک لنگڑا ہمیں دق نہیں کرتا مگر ایک احمق ہمیں بہت کھلتا ہے؟ اس لیے کہ لنگڑا یہ جانتا ہے کہ ہم سیدھا چلتے ہیں مگر احمق یہ جتلاتا ہے کہ یہ ہم ہیں جو بیوقوف ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم احمق پر غصہ نہ کیا کرتے بلکہ اس پر ترس کھاتے۔

اسی بات کو وہ یوں آگے بڑھاتا ہے کہ اگر کوئی ہمیں بتائے کہ تمہارے سر میں درد ہے یا تم لنگڑے ہو تو ہم ناراض نہیں ہوتے، لیکن کوئی ہمیں کہے کہ تم غلط سوچتے یا غلط انتخاب کرتے ہو تو ہم ناراض ہوتے ہیں۔ کیوں؟ وجہ یہ ہے کہ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہمیں سر درد نہیں ہے، لیکن اس درجے کا یقین ہمیں کسی شے کا انتخاب کرتے ہوئے نہیں ہوتا کیوں کہ ہم جیسی ہی عقل اور سوجھ بوجھ استعمال کرتے ہوئے کوئی دوسرا اس کے برعکس بھی انتخاب کرتا ہے۔ یہ شے ہمیں اپنے مؤقف کے بارے میں تجسس، حیرت اور شک میں ڈالتی ہے اس لیے ہمیں اس پر غصہ آتا ہے لیکن سر درد یا اپاہج ہونے کے معاملے میں ہمارے جذبات کبھی اس طرح کے تضاد یا عدم یقین کا شکار نہیں ہوتے![۲۱]۔

ہم نے مضمون کے آغاز میں پاسکل اور وجودیت کے حوالے سے کچھ باتیں کی تھیں۔ اب ہم پھر اسی کی طرف لوٹتے ہیں۔ مگر پہلے خواطر سے پاسکل کا ایک خوب صورت اور ادبی معنویت کا حامل یہ "وجودیتی" اقتباس دیکھیے:

> انسان محض ایک سرکنڈا ہے، فطرت کی سب سے کم زور چیز۔ وہ صرف سوچنے والا سرکنڈا ہے۔ اس کو کچلنے کے لیے کائنات کو ہتھیار بند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بخار، پانی کی ایک بوند اسے مارنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن، اگر کائنات اسے کچل ڈالتی، انسان تب بھی اپنے قاتل سے زیادہ بلند مرتبہ ہوتا کیوں کہ وہ اپنی موت کو جانتا ہے اور اس حوالے سے کائنات، اس سے بڑے ہونے کا تفوق رکھنے کے باوجود، اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ بس ہمارا سارا وقار اور عظمت ہمارے سوچنے میں ہے۔ اس کے ذریعہ ہمیں خود کو بلند کرنا چاہیے، نہ کہ زمان اور مکان کی بنیاد پر جسے ہم کبھی بھر نہیں سکتے۔ آیئے، ہم اچھا سوچنے کی کوشش کریں۔ یہی اصولِ اخلاق ہے[۲۲]۔

پاسکل کی اس وجودیت کو بیسویں صدی کی وجودیت کے تناظر میں بھی دیکھنے کی ضرورت ہے۔ سوال ہے کہ اگر وجودیت کی ژاں پال سارتر (Jean-Paul Sartre۔۱۹۰۵ء-۱۹۸۰ء) کی ''وجود جوہر پر مقدم ہے'' [۲۳] والی یہ تعریف درست ہے تو پھر پاسکل جو انسان کو آزاد بھی مانتا ہے اور مجبور بھی جس کے نزدیک عقل بھی ابر آلود ہوتی ہے اس لیے اصل فیصلہ کن عامل خدائی فضل ہی ہے، نہ کہ انسانی عمل تو پھر پاسکل جیسے ''فضلی'' کو وجودی کیسے کہا جا سکتا ہے؟؟

اس سوال کا کچھ جواب ہمیں وجودیوں کے ذمہ داری والے تصور میں مل سکتا ہے۔ ان کے نزدیک چوں کہ انسان دنیا میں اس کی خواہش اور مرضی کے بغیر پھینک دیا گیا اس لیے خواہی نہ خواہی وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔

> انسان آزاد رہنے پر مجبور ہے۔ اب جبکہ وہ دنیا میں پھینک دیا گیا ہے تو وہ اپنے ہر کام کا ذمہ دار ہے۔[۲۴]

''اس جبری آزادی'' سے اس کے اندر ذمہ داری کا ہول ناک احساس، ''وجودی کرب'' (Existential angst)، پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو سارتر کا تصور ہوا۔ اس کے دوست اور بعد میں اس سے فکری علیٰحدگی اختیار کرنے والے البرٹ کامیو نے، جو وجودیوں کا دوسرا بڑا امام ہے، *The Myth of Sisyphus* میں دنیا اور اس میں انسانی صورت حال کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ اور بھی دل چسپ ہے۔ البرٹ کامیو یہاں اس لیے بھی زیادہ بامعنی ہے کہ ''وجودی کرب'' سے نجات کے لیے ایمان کا راستہ اختیار کرنے کو وہ فلسفیانہ خودکشی کہتا ہے اور یہ بات پاسکل کے ایمانی تصور سے بالکل متضاد ہے! البرٹ کامیو کا کہنا ہے کہ میں:

> اس دنیا کو میں چھو سکتا ہوں، اور فیصلہ بھی کرتا ہوں کہ یہ موجود ہے۔ یہاں پہنچ کر میرا سارا علم ختم ہو جاتا ہے، اور باقی محض تشکیلیہ ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر میں اس نفس کو ضبط کرنے کی کوشش کروں جس کا مجھے یقین ہے، اگر میں اس کی وضاحت اور خلاصہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں، تو یہ میری انگلیوں میں پھسلتے پانی کے سوا کچھ نہیں۔[۲۵]

یہ کائنات بس ''ہے''، اس میں نہ کوئی معنویت ہے اور نہ کسی عقلی دلیل سے اسے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں انسان ایک ازلی بے معنی بیگار کاٹنے کے لیے آیا ہے۔ البرٹ کامیو کے نزدیک دنیا کی لایعنیت کی بہترین تمثیل سیسیفس (Sysiphus) ہے جسے دیوتاؤں نے ایک چٹان کو چوٹی پر پہنچانے کی مستقل مشقت پر لگا رکھا تھا۔ بھنچے چہرے اور پچکے گالوں والے سیسیفس کا کندھوں پر چٹان اٹھا کر چوٹی پر جانا پھر پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بے بسی سے اسے نیچے لڑھکتے دیکھنا اور ہزارویں لاکھویں دفعہ پھر اسے اوپر لے جانے کا عمل، کامیو کے نزدیک لایعنیت کی علامتی تمثیل ہے اور ازل سے جاری اس ڈرامے کا ابسرڈ ہیرو سیسفس ہے۔ جب وہ بے کسی سے نیچے لڑھکتے پتھر کو دیکھتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کی یہ مشقت کب تک جاری رہے گی تو یہ لمحہ کرب اس کے لیے لمحۂ شعور ہوتا ہے جو مقدر پر اس کی فضیلت کا ضامن بنتا ہے۔ یہ کہانی اگر ایک المیہ اسطورہ ہے تو صرف اس لیے کہ اس کا ہیرو باشعور ہے۔ دنیا میں آج کا مشقتی انسان بھی اسی غیر مختتم لایعنیت کا شکار ہے اور وہ علامتی ابسرڈ ہیرو سیسیفس سے کسی طرح کم ابسرڈ نہیں

ہے۔ سیسیفس اپنے دیوتاؤں کا پرولتاری تھا۔ اسی کی طرح آج کا انسان بھی اپنے ماحول میں نا مختتم مشقت اور لایعنیت کی اذیت کے شعور کی وجہ سے اپنے سر پر فتح مندی کا تاج رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ سب کچھ بے معنی ہے مگر اس کے باوجود وہ اس سے نظریں نہیں چراتا، لایعنیت کی اذیت کو پورے شعور کے ساتھ قبول کر کے آزادی اور کامرانی پاتا ہے[۲۶]۔

پاسکل کے درج بالا اقتباس "انسان محض ایک سرکنڈا ہے۔۔۔" کو اگر سارتر اور کامیو کے ذمہ داری اور شعور کے ان تصورات سے موازنہ کر کے دیکھا جائے تو پاسکل کی وجودیت اور بیسویں صدی کی وجودیت میں ہمیں انسانی فضیلت کی بنیاد علم اور شعور نظر آتا ہے مگر اس علم اور شعور کی بنیاد پر دنیا اور کائنات کے بارے میں روّیہ اختیار کرنے کے معاملے پر پاسکل اور کامیو وغیرہ میں لاکھوں فرسنگ کا اختلاف ہے۔ پاسکل بیرونی کائنات سے اپنے علم کے امتیاز کی بنیاد پر کائنات سے بلند ہو کر ماورا سے اپنا تعلق پیدا کرنے کا سامان نکالتا ہے جس کا دوسرا مطلب خدا پر ایمان ہے جبکہ اس کے برعکس ملحد (Atheist) وجودیوں کے نمائندے کے طور پر کامیو کے نزدیک ایمان ایک طرح کی خودکشی ہے جس سے وہ جسمانی خودکشی کے مقابلے "فلسفیانہ خودکشی" کہتا ہے۔ خودکشی اور فلسفیانہ خودکشی کے بارے میں اپنے "سیسیفس اسطورہ" میں البرٹ کامیو نے جابجا کلام کیا ہے۔ ملاحظہ ہوں اس کے دو اجزاء بہ عنوان Absurdity and Suicide اور Philosophical Suicide۔ خودکشی کے مسئلے سے پہلے کامیو کے لایعنیت کے تصور کو سمجھنے کی ضرورت ہے جس کے مطابق انسان کے اندر زندگی اور کائنات کی حتمی معنویت کا سراغ لگانے کی ان تھک خواہش ہے مگر تمام تر عقلی کاوشوں کے باوجود انسان کو جب اس کا کوئی بامعنی جواب نہیں ملتا تو اس کے اندر ایک مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ اس مایوسی کی شناخت لایعنیت سے ہوتی ہے۔ اس مہملیت / ایبسرڈٹی کا حاصل ایک ہولناک جذبہ خوف، دہشت یا وجودی کرب ہے۔ مگر اصل سوال اس جذبے کے ساتھ نباہ کر سکنے اور اس کے قوانین کو قبول کر سکنے کا ہے[۲۷]۔

اپنی تمام تر عقلی کاوشوں کے باوجود انسان کو جب کائنات میں کسی معنویت اور مقصدیت کا سراغ نہیں ملتا تو اس ایبسرڈٹی کے کرب کی سہار نہ پا کر بعض لوگ خودکشی کرتے ہیں اور بعض مذہب میں پناہ لیتے ہیں۔ کامیو ان دونوں صورتوں کو حقیقت سے فرار اور برا سمجھتا ہے (اگر کوئی خدا کو نہیں مانتا تب بھی اس کے لیے خودکشی جائز نہیں۔ مقدمہ سیسیفس)۔ جسمانی خودکشی اس لیے بری ہے کہ یہ ذہن یعنی آلہ شعور کو ختم کر دیتی ہے جس کا کام عقلی بنیاد پر کائنات کی معنویت کی تلاش میں وجودی کرب کی نہ بجھنے والی آگ میں جلتے ہوئے ظفرمندی کے ساتھ زندہ رہنا ہے۔ یہ گویا دیوتاؤں کے خلاف انسان کی بغاوت ہے جو لڑتے لڑتے موت سے ہم کنار ہونے والے آدمی کا احساسِ تفاخر ہے۔ جب کہ اس کے برعکس ایمانی زقند (Leap of Faith) یعنی مذہبی مفہوم میں خدا پر ایمان لانے کو کامیو فلسفیانہ خودکشی کہتا ہے۔ فلسفیانہ خودکشی کو کامیو اس لیے ناپسند کرتا ہے کہ یہ شعور کے لازمی اقتضا یعنی لایعنیت کے روبرو ڈٹ کر رہنے والے استدلالی عمل اور عقلی فعلیت کو معطل کرنے کا راستہ ہے۔ کامیو نا لایعنیت سے آنکھیں چرانے والے

کسی ارضی اخلاقی نظریے کو قبول کرنے کا حامی ہے اور نہ ایمانی زقند والی سماوی حیات ابدی والے تصور کو قبول کرنے پر راضی ہے۔

یہاں یہ سوال بجا طور پر اٹھایا جا سکتا ہے کہ جب دنیا مہمل / ایبسرڈ ہے ہر قسم کی معنویت، مقصدیت اور اخلاقی قدر سے خالی ہے اور عقل کی مدد سے اس میں کوئی معنویت پیدا بھی نہیں کی جا سکتی تو پھر ایسی کٹھور دنیا میں انسان کس برتے پر اور کب تک لایعنیت کا جوا گلے میں ڈالے کولھو کا بیل بن کر زندہ رہ سکتا ہے؟ ایبسرڈ ہیرو کو رومانویت کے سنگھاسن پر جتنا چاہے چڑھایا جائے، حقیقت یہ ہے کہ لایعنیت کا یہ بوجھ زیادہ دیر تک سارتر اور کامیو خود بھی نہیں ڈھو سکے تھے۔ تنگ آ کر ایک (سارتر) نے مارکسیت کے نظریے میں پناہ لے لی اور دوسرے (کامیو) کی "انسان دوستی" نے الجزائری مسلمانوں کے خلاف محاذ قائم کر کے الجزائر کی تحریکِ حریت کی مخالفت اور فرانس کے استعماری عزائم پر خاموشی شعار کر کے اپنا ایک "مقصد" ایجاد کر لیا تھا۔ ایسی مزے کی انسان دوستی پر کون نہ مر جائے اے خدا!

محمد حسن عسکری (۱۹۱۹ء-۱۹۷۸ء) جو ویسے البرٹ کامیو کی ادبی و سماجی حسیّت کے بہت قائل تھے اور ادیب کی سماجی ذمہ داری کے مسئلے پر کامیو کی ادبی تحریروں کو بطور مثال پیش کیا کرتے تھے مگر جب اس نے فرانسیسی نوآبادیات سے الجزائر کی جنگ آزادی (۱۹۵۴ء-۱۹۶۲ء) کے دوران اپنے آبائی وطن الجزائر کے بجائے فرانسیسی استعمار کا ساتھ دینا شروع کیا تو سن ۱۹۵۷ء-۱۹۵۸ء کے اپنے متعدد مضامین میں عسکری نے کامیو کی اس دو عملی / منافقت پر کھل کر آواز اٹھائی تھی[۲۸]۔ اسی طرح ایڈورڈ سعید (Edward Wadie Said۔ ۱۹۳۵ء-۲۰۰۳ء) نے بھی ۱۹۹۳ء میں چھپنے والی اپنی کتاب ثقافت اور استعمار میں کامیو کے ناولوں میں الجزائر کے "بے نام و بے چہرہ" عرب کرداروں کے تجزیے کے ذریعے البرٹ کامیو کی خاموش استعمار پرستی پر سوال اٹھائے ہیں اور اس سے پہلے استشراق میں بھی اس پر کلام کر چکا تھا[۲۹]۔ سوال ہے کہ اس اندھی بہری اور شعور سے عاری کائنات کے مہیب اور بے کراں سناٹے میں بھٹکتے انسان کو اگر پاسکل ماورا کا راستہ دکھائے تو اسے فلسفیانہ خودکشی کیوں قرار دے دیا جاتا ہے جب کہ "وجودی کرب" کا انجام صرف خودکشی یا زیادہ سے زیادہ کسی جعلی مقصد ایجادی کے سوا کیوں کچھ نہیں؟

جدید وجودیوں کے یہاں کائنات اور زندگی کا بنیادی اصول، لاعقلیت (Irrationalism) ہے جب کہ پاسکل جیسے لوگ عقل کو ردّ کرنے کے بجائے اس کی محدودیت کے سبب دل سے رہنمائی پانے کا چینل کھلا رکھتے ہیں۔ ان دونوں رویّوں میں بہت بنیادی فرق ہے: جدید لاعقلیت، جس کی طرف ابتدائی مگر نہایت پُراعتماد قدم، جدیدیت کے آخری سانسوں کے زمانے میں بلاشبہ، وجودیت پسندوں نے اٹھائے مگر جسے آخری حدوں تک مابعد جدید مفکرین لے گئے، کا المیہ یہ ہے جب یہ منہ کے بل گرتی ہے تو پھر آگے کا کام جذبے اور حیوانی جبلتیں سنبھال لیتی ہیں۔ جب کہ اس کے برعکس پاسکل جیسے لوگوں کا طریق کار نیچے گرنے کی بجائے ہمیشہ اوپر کی طرف اٹھنے کا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آج کے ذہن کے لیے دل کی منطق والی بات کوئی عجوبہ ہو لیکن دیگر تہذیبوں کی

طرح قرونِ وسطیٰ کی مسیحی تہذیب بھی دل کی آنکھ سے دنیا کو دیکھنے والی تہذیب تھی۔ خواطر میں اس طرح کے خیالات اکثر ملتے ہیں:

> دل کی اپنی عقلیں ہوتی ہیں، جنھیں عقل نہیں جانتی۔ ہم یہ ہزاروں چیزوں میں محسوس کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ دل فطری طور پر وجودِ کلی سے پیار کرتا ہے، اور بالکل فطری طور پر کچھ چیزوں کو یہ اپنا آپ بھی دے دیتا ہے اور اپنی مرضی سے ہی کسی ایک یا دوسری شے کے خلاف سخت ہو جاتا ہے۔ تم نے ایک کو مسترد کر دیا ہے اور دوسرے کو رکھا ہے۔ تم جو خود سے محبت کرتے ہو تو کیا یہ عقل کی بنیاد پر ہوتا ہے؟
>
> یہ دل ہے جو خدا کو محسوس کرتا ہے نہ کہ عقل۔ پس یہ ایمان ہے: خدا کو دل نے محسوس کیا ہے نہ کہ عقل نے۔ ہم سچائی کو نہ صرف عقل سے جانتے ہیں بلکہ دل سے بھی جانتے ہیں، اور یہ آخر والا ہی وہ طریقہ ہے جس سے ہم اصولِ اوّلیہ کو جانتے ہیں۔ اور عقل جس کا اس معاملے میں کوئی حصہ نہیں ہے وہ انھیں ردّ کرنے کی ناحق ہی کوشش کرتی ہے۔ تشکّکین جن کے پاس اپنے مقصد کے لیے بس یہی عقل ہے بیکار ہی مشقت جھیلتے ہیں[۳۰]۔

اب ہم اپنے اس بنیادی سوال کی طرف لوٹتے ہیں کہ پاسکل کو کس حد تک وجودی (Existentialist) قرار دیا جا سکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیکراں کائنات کی وسعتوں میں ذرے کی سی حیثیت والے انسان کی نوحہ گری کرنے اور خدائی فضل کی بنیاد پر آزادی پا کر اپنی "ذمہ داری" اور "عمل" سے مفر نہ پاسکے والا تصورِ انسان رکھنے کی وجہ سے پاسکل بے شک وجودی ہے۔ اس کے علاوہ پاسکل میں اور بیسویں صدی کے وجودیوں میں کوئی شے مشترک نہیں۔ اس طرزِ وجودیت میں اگر کوئی شخص پاسکل کے کچھ قریب پہنچا ہے تو وہ کیر کے گور ہے۔ ولیم بیریٹ نے کیر کے گور کے بارے میں لکھا ہے کہ اپنے آبائی شہر کوپن ہیگن کے گلی کوچوں میں اپنی جھکی کمر، بد قطع جسم اور بد وضع حلیے و ہئیت کذائی کیساتھ جب وہ نکلتا تو قصبے کے لونڈے لپاڑے اس کبڑے کے پیچھے اچھلتے کودتے شور مچاتے "Either/or! Either or" کے نعرے لگاتے جاتے مگر وہ گرد و پیش سے بے نیاز اپنی سوچوں میں گم چلتا رہتا مگر ہیگل کا ذکر آتا تو وہ بپھر کے ننگی تلوار بن جاتا! اس کا معروف جملہ ہے:

> یہ صرف عقل تھی اور اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں کہ جس کی مخالفت کی جانی ضروری تھی۔ غالباً اسی لیے میں، جس کے ذمہ یہ کام تھا، بے پناہ عقل سے لیس کیا گیا تھا۔[۳۱]

بغیر کسی بناوٹی انکسار اور بنا کوئی شیخی بگھارے اس نے اپنے بارے میں کتنی سچی بات کہہ دی ہے۔۔۔ بیرٹ کا کہنا ہے کہ وہ عقل کی بے توقیری بالکل نہیں کرتا بلکہ اس کے برعکس وہ اس کا ذکر احترام بلکہ تعظیم کے ساتھ کرتا ہے۔ تاہم تاریخ کے ایک خاص مرحلے پر، بہترین عقلی قویٰ سے لیس کسی آدمی کی طرف سے تمام تر دستیاب وسائل اور طاقت کے ساتھ، عقل کی مخالفت ضروری تھی۔ اس سلسلے میں اس نے جو کامیابی حاصل کی اور جو کر دکھایا اس سے بہتر کچھ اور ممکن نہیں تھا![۳۲]

کہا جاتا ہے کہ بیسویں صدی میں سائنس کو عالم طبیعی میں اس کی تنگ و تاز کے حتمی اور غیر متبدل تیقن سے باہر نکال کر عجز کی راہ پر رکھنے کا فریضہ کارل پاپر(Karl Raimund Popper۔۱۹۰۲ء-۱۹۹۴ء) کے اصولِ بطلان و تغلیط(Falsification) نے سر انجام دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دورِ جدیدیت کی مزعومہ سب سے افضل انسانی صلاحیت، عقل، کو اس کی نارسائی کا یہ سبق بھی صدیوں پہلے پاسکل نے پڑھایا تھا:

> عقل کی انتہائی فعلیت یہ تسلیم کرنا ہے کہ چیزوں کی ایک لامحدود تعداد ہے جو اس کی حد سے باہر ہے۔ اب تک اگر وہ یہی نہیں جان سکی تو پھر یہ بہت کمزور ہے۔ لیکن اگر طبیعی چیزیں ہی اس کی حدِ رسائی سے باہر ہیں تو مافوق الطبیعت کا کہنا ہی کیا![۳۳]

عسکری سے مستعار ایک خیال کے مطابق کامیو اور دوسرے غیر مذہبی وجودی جب عقل کا انکار کرتے ہیں تو وہ حیوانی جبلتوں کے پاتال میں گرتے ہیں[۳۴]۔ جب کہ پاسکل جیسے اصحاب عرفان جب انسانی عقل کی محدودیت سے نکلتے ہیں تو بجائے پستی میں اترنے کے وہ اوپر ہی اٹھتے ہیں۔

ولیم بیرٹ نے پاسکل کے تصور خدا پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے نزدیک ہر زمانے میں ایسے ذہین لوگ موجود رہتے ہیں جو خدا کے وجود کے دلائل کو انتہائی وثوق انگیز سمجھتے ہیں اور انھی کی سطح کے ذہین لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو وجود خدا کے دلائل کو انتہائی ناکافی اور غیر فیصلہ کن سمجھتے ہیں۔ اور مزے کی بات ہے کہ ان دونوں اطراف کے لوگ دوسری طرف والوں کو بدنیت بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وجودِ خدا کے یہ دلائل انھی کو متاثر کرتے ہیں جو انھیں قبول کرنا چاہتے ہیں اور انھیں بالکل متاثر نہیں کرتے جو انھیں قبول نہیں کرنا چاہتے۔ لہٰذا یہ معاملہ ''ثبوتوں'' کا ہے ہی نہیں۔ کڑے عقلی استدلال کا مدلول بن سکنے والے خدا (خواہ یہ 'استدلال' آج موجود ہو یا گمان کرنا کہ مستقبل میں پیدا ہو جائے گا) کا سچی مذہبی ضرورت سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ ایسا خدا زیادہ سے زیادہ ایک مجرد دائرے یا مثلث کی طرح ایک نیوٹرل وجود ہی رہے گا جن کے بارے میں ماہرینِ جیومیٹری و ریاضی اپنے استدلالات کرتے رہتے ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پاسکل پکار اٹھتا ہے:

> ابراہیم کا خدا، اسحاق کا خدا، یعقوب کا خدا نہ کہ فلسفیوں اور عالموں کا[۳۵]۔

تو صاحبو بات یہ ہے کہ وجود خدا کے عقلی دلائل ایک صاحب ایمان کے کام کے نہیں ہوتے اور نہ ماننے والے کے لیے وہ تسلی بخش نہیں ہوتے۔ یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہے گا۔ عقل اور مذہب کے ہمیشہ سے جاری تنازعے میں توازن کی بات بھی پاسکل ہی نے کی ہے:

> اگر ہر شے کو عقل کے تابع کر دیا جائے تو مذہب میں کوئی پر اسرار اور مافوق الفطرت عنصر نہیں رہے گا اور اگر ہم عقل کے اصولوں کی خلاف ورزی کریں گے تو مذہب مہمل اور مضحکہ خیز ہو کر رہ جائے گا[۳۶]۔

***

اس طول کلامی میں پاسکل کے تصورِ خدا، انسان کی بے چارگی، دہشت اور وجودیت کے مسائل کو موضوع بنانے کا سبب یہ ہے کہ ہمارے زمانے کے سب سے بڑے مسئلے تشکیک اور تہذیبی آشوب کے لیے پاسکل کا یہ ذہنی سفر اور اس کے حاصلات بہت با معنی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک وجودیت اور اس کے مباحث اردو ادب میں بھی بہت عام تھے مگر آج کل بوجوہ ایسا نہیں ہے۔ ہمارے ہاں وجودیت کی بحثوں میں اگرچہ کیر کے گور کا بھی نام آتا رہا لیکن زمانے کی مخصوص رو کی ہم سمتی میں ہمارے ہاں سارتر اور کامیو کے وجودی تصورات زیادہ زیر بحث رہے ہیں۔ اپنے معروف مضمون “Existentialism is a Humanism” میں سارتر نے وجودیت کے جو دو بڑے زمرے قائم کیے تھے ان میں اس نے جیسپرس(Karl Theodor Jaspers۔۱۸۸۳ء-۱۹۶۹ء) اور گابرئیل مارشیا(Gabriel Honoré Marcel۔۱۸۸۹ء-۱۹۷۳ء) کا شمار مذہبی وجودیوں میں اور ہائیڈگر (Martin Heidegger۔۱۸۸۹ء-۱۹۷۶ء) اور دیگر فرانسیسی وجودیوں کے ساتھ اپنا شمار ملحد (Atheist) وجودیوں میں کیا تھا[۳۷]۔ ساٹھ کے عشرے میں جب ہمارے ہاں وجودیت کی بحثیں عام ہوئیں تو ہمارے ادیبوں نے اگرچہ کھلے بندوں خدا کا انکار کبھی نہیں کیا تھا مگر انھوں نے افسردگی، اداسی، پژمردگی، مردنی، باطنی بنجر پن، انتشار، نراجیت، کرب، خوف ایک مہیب وجودی لایعنیت اور مہمل صورت حال کے جو زیادہ اثرات قبول کیے وہ اکثر وبیشتر سارتر اور البرٹ کامیو جیسے وجودیوں ہی سے آئے تھے۔ خدا و تقدیر بے زاری اور باطنی خالی پن و بے مقصدیت کے احساسات بھی ہمارے اردو ادب میں ایک زیریں اور خاموش رو کے طور موجود رہے ہیں۔

ادبی تھیوری اور اس کے ذیلی مباحث ساختیات، پس ساختیات، تانیثیت، نو تاریخیت، مابعد جدیدیت، اور پس نو آبادیاتی مطالعات کے مسائل نے ہمارے ہاں اب اگرچہ وجودیت کے مباحث کو پس پشت ڈال دیا ہے مگر مہابیانیوں کے انہدام اور سماجی و تہذیبی تکثیریت کی نو بہ نو شکلوں کے باجود نراجیت، احساس تنہائی، بیگانگی، سماجی رشتوں کا کھوکھلا پن آج اور بھی زیادہ المناک صورت اختیار کر چکا ہے۔ پرانا نو آبادیاتی بندوبست اگرچہ ختم ہو گیا ہے مگر چھوٹے ملک اور کمزور قومیں پہلے سے بڑھ کر شاطر طاقتوں کے اقتصادی شکنجوں میں ہیں۔ نفسی کیفیات کی زبونی اور روحانی احوال کا بنجر پن جو نفسیاتی تشکیک اور فکری ارتیابیت کا اصل سبب ہوا کرتا ہے وہ آج بھی جوں کا توں موجود ہے۔ انسان آج بھی درماندگی اور لاچارگی کی اسی مہیب دبدھا میں مبتلا ہے جس کے کچھ نمونے ہم نے پاسکل کی خواطر میں دکھائے اور جو بعد میں ”وجودی کرب“ کے عنوان سے معروف ہوئے لیکن زمانے کا فیشن بدلنے کے سبب جو اب ان لفظیات و اصطلاحات میں زیر بحث کم آتے ہیں۔

جس طرح سارتر نے وجودیت کے مختلف مکاتب کا تجزیہ کر کے ان کا مابہ الاشتراک مسئلہ ”وجود کی جوہر پر تقدیم“ بتایا

تھا اسی طرح یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ مابعد جدید مفکرین کے مابین باہمی طور پر خواہ جتنے بھی اختلافات ہوں مگر جدیدیت کے مابہ الاشتراک اور مدارالمہام عنصر، عقل کے ''ناکافی پن'' پر ان کے ہاں اکثر و بیشتر اتفاق پایا جاتا ہے اور اس امر کو مابعد جدیدیت کی سب سے بڑی دین سمجھا جاتا ہے! لیکن حقیقت یہ ہے کہ عقل کی کلی استعداد، مرکزیت اور خود مختاری پر سوالات اگرچہ کانٹ کے زمانے سے ہی اٹھنا شروع ہوگئے تھے مگر عقل کی حاکمیت پر سب سے کڑی ضربیں دوسری بڑی جنگ کے بعد کے زمانے میں وجودیت و مہملیت پسندوں اور ایبسرڈ تھیٹر والوں نے لگائی ہیں، اس لیے راقم کا خیال ہے کہ مابعد جدیدیت کے سب سے بڑے سروکار، مہابیانیوں کے اختتام کے پیچھے اصل کام وجودیت کے رویوں کا ہے۔ یعنی وہ مہم جو عیسوی روایت میں نہایت شدت کے ساتھ پاسکل نے شروع کی تھی بیسویں صدی کی وجودیت نے (اس فرق کے ساتھ جو اوپر بیان ہوا) اسے درجہ کمال تک پہنچادیا۔

قیام پاکستان کے زمانے اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک ادب کی تہذیبی جڑوں کے سوالات کسی نہ کسی انداز میں ہمارے ادب کا موضوع بنے رہے تھے لیکن پھر رفتہ رفتہ پہلے اس طرف سے ایک لاتعلقی سی پیدا ہوئی اور اب ہمارے دانش ور طبقے میں ان معاملات کی طرف باقاعدہ بے زاری و مخالفت کا رویہ پیدا ہو چکا ہے! آج جب کہ باقی دنیا کی طرح ہمارے پڑھے لکھے لوگ، ادیب اور دانش ور بھی اپنی تہذیبی جڑوں اور مذہبی اقدار سے بیگانہ ہو کر عموماً ایک تہذیبی آشوب کا شکار ہیں، تہذیبی اقدار کے زوال اور روحانی بنجر پن کی اس صورت حال میں کیا یہ ممکن نہیں کہ اردو ادب میں پھر سے کوئی وجودیت کی لہر پیدا ہو؟ اور اس دفعہ ہمارا ادب پاسکل اور کیر کے گور والی وجودیت میں اٹھائے گئے سوالات و مسائل کی تفہیم کرے اور یہ دیکھے کہ وہ معاصر تہذیبی آشوب سے عہدہ برآ ہونے میں کس قدر معاون ہو سکتی ہے۔ ہم بڑے ازہان سے اتفاق کریں یا اختلاف، مگر ان سے مکالمہ ہمیں ذہنی فعالیت سے ہم کنار کرتا ہے اور مسائل کو مختلف تناظرات میں سمجھنے میں ضرور مدد دیتا ہے۔

ہر زمانے کی طرح ہمارے دور کے بڑے مسئلے بھی تعقل، تشکیک اور توہم یا ضعیف الاعتقادی ہیں۔ تعقل کی حقیقی نوعیت جانے بغیر ہر شے کو تعقلات کا درجہ دینے کی بات ہو، تسلیم کی جگہ تشکیک کا ابتلا ہو، یا غور و فکر کی جگہ بے سوچے سمجھے تسلیم و رضا کی روش، یہ تینوں روّیے در حقیقت عقل کی اصل قوت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

ان تینوں روّیوں کے تریاق کے طور پر ہم پاسکل کی اس پُر حکمت بات کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اس کتھا کھتونی کا یوں اختتام کرتے ہیں:

> تسلیم و رضا- ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ کہاں شک کرنا ہے، کہاں متیقن ہونا ہے، کہاں سر تسلیم خم کرنا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتا وہ عقل کی قوت کو نہیں سمجھتا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو یہ جانے بغیر کہ برہان کیا ہوتا ہے ہر چیز کو مُبَرہَن و مسلّم مان کے؛ یا یہ جانے بغیر کے کہاں تسلیم و رضا دکھانی ہے ہر چیز پر شک کر کے؛ یا کھرا کھوٹا پرکھنے کی

صلاحیت کے بغیر ہر بات کے آگے سرِ تسلیم خم کر کے، ان تینوں اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہیں[۳۸]۔

شراب خانوں کی خاک ہے اور میرا سرِ تسلیم
مدعی اگر بات نہ سمجھے تو کہہ دو سر ہے اور پتھر ہے

روزِازل کے گزرے ہوئے معاملے سے مجھے نا امید نہ رکھ
تجھے کیا معلوم پردے کے پیچھے کون اچھا ہے اور کون بُرا ہے[۳۹]
(حافظ)

حواشی و حوالہ جات

*	(پ:۱۹۶۳ء) ایسوسی ایٹ پروفیسر / صدر شعبۂ اردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

۱۔	جدید نظریۂ اغلبیت (Probability) کا بانی کہلانے والا بلیز پاسکل ریاضی دان، ماہر طبعیات اور مذہبی فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان کا ایک منفرد اور صاحب اسلوب نثر نگار بھی تھا۔ اپنی مختصر سی عمر کے آخری حصے میں کچھ روحانی مکاشفات و واردات سے گزرنے پر اس نے اپنے ان تجربات کو لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو اس کی موت کے سبب ادھورا رہ گیا تھا۔ ۱۶۵۷ء اور ۱۶۵۸ء کے موسم گرما کے درمیان، اس کے ان شذرات اور ٹکڑوں کو اکٹھا کیا جنھیں مرتبین نے *Pensées* (''خیالات'') عنوان کے تحت شائع کیا۔ دیکھیے:

https://www.britannica.com/topic/Pensees، (۲۹ مئی، ۲۰۲۲ء)۔

اگر یہ کہا جائے کہ ریاضی طبعیات اور فلسفے کے علاوہ پاسکل کی شہرت بیش از بیش اس کے انتقال کے بعد ۱۶۷۰ء میں شائع ہونے والی مختلف رنگ و بو کے پھولوں جیسے بکھرے خیالات پر مشتمل اس چھوٹی سی کتاب پر ہے تو کچھ غلط نہ ہو گا! فرانسیسی زبان کی اس غیر رسمی کتاب *Pensées* کے عنوان کا مطلب افکار و خیالات ہے۔ فارسی میں اسے خواطر کا عنوان بھی دیا گیا ہے۔ راقم کے پیش نظر اس کتاب کے متعدد آن لائن نسخے رہے ہیں لیکن حوالوں کے لیے زیادہ انحصار Gutenberg, 2006 والے مندرجہ ذیل ایڈیشن پر رہا ہے جو W.F Trotter کا ترجمہ ہے۔

بلیز پاسکل [Blaise Pascal]، *Pensées*، (نیویارک: ای پی دتن اینڈ کمپنی، ۱۹۵۸ء)۔

https://www.gutenberg.org/files/18269/18269-h/18269-h.htm، (۲۹ جنوری، ۲۰۲۲ء)۔

حوالے کے لیے صفحات نمبر کے بجائے پیراگراف نمبر استعمال گئے ہیں تاکہ کسی بھی نسخے سے تلاش کرنے میں آسانی رہے۔ مختلف نسخوں میں پیراگراف کے نمبروں میں اگرچہ ذرا سا فرق ہے مگر یہ قابل نظر اندازی ہے! راقم کے پیش نظر *Pensées* کے ایک انتخابی ترجمے کا منصوبہ بھی ہے جس کے لیے ''نزہتہ الخواطر'' کا عنوان سوچا ہے! تاہم متن میں *Pensées* کا ذکر خواطر کے عنوان سے ہی کیا جائے گا۔

۲۔	بلیز پاسکل [Blaise Pascal]، *Pensées*، (نیویارک: ای پی دتن اینڈ کمپنی، ۱۹۵۸ء)، پیراگراف ۲۳۳۔

۳۔	بلیز پاسکل [Blaise Pascal]، *Pensées*، https://www.gutenberg.org/files/18269/18269-h/18269-h.htm (۲۹ جنوری ۲۰۲۲ء)۔

۴۔	اصل انگریزی اقباس:

> "When I consider the short duration of my life, swallowed up in the eternity before and after, the little space which I fill, and even can see, engulfed in the infinite immensity of spaces of which I am ignorant, and which know me not, I am frightened, and am astonished at being here rather than there; for there is no reason why here rather than there, why now rather than then. Who has put me here? By whose order and direction have this place and time been allotted to me?"

بلیز پاسکل [Blaise Pascal]، *Pensées*، (نیویارک: ای پی دتن اینڈ کمپنی، ۱۹۵۸ء)، پیراگراف ۲۰۵۔

۵۔	اصل انگریزی اقباس:

> "When I see the blindness and the wretchedness of man, when I regard the whole silent universe, and man without light, left to himself, and, as it were, lost in this corner of the universe, without knowing who has put him there, what he has come to do, what will become of him at death, and incapable of all knowledge, I become terrified, like a man who should be carried in his sleep to a dreadful desert island, and should awake without knowing where he is, and without means of escape. And thereupon I wonder how people in a condition so

wretched do not fall into despair. I see other persons around me of a like nature. I ask them if they are better informed than I am. They tell me that they are not. And thereupon these wretched and lost beings, having looked around them, and seen some pleasing objects, have given and attached themselves to them. For my own part, I have not been able to attach myself to them, and, considering how strongly it appears that there is something else than what I see, I have examined whether this God has not left some sign of Himself.”

بلیز پاسکل[Blaise Pascal]، *Pensées*، پیرا گراف ۶۹۲۔

۶۔ ولیم بیرٹ[William Barrett]، *Irrational man*(ڈبل ڈے اینکر بکس، ڈبل ڈے اینڈ کمپنی گارڈن سٹی ۱۹۵۸ء)، ۱۰۴۔

۷۔ ولیم بیرٹ[William Barrett]، *Irrational man*، ۹۷۔

۸۔ بلیز پاسکل[Blaise Pascal]، *Pensées*، پیرا گراف ۲۰۶۔

۹۔ یہ گنبدِ مینائی، یہ عالمِ تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہوا راہی میں، بھٹکا ہوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی!
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی، میں شعلۂ سینائی!

علامہ محمد اقبال، بالِ جبریل، مشمولہ کلیاتِ اقبال (اردو)(لاہور: اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۹ء)، ۴۹-۴۴۸۔

۱۰۔ البرٹ کامیو[Albert Camus]، *The Myth Of Sisyphus And Other Essays* مترجم: جسٹن او برائن(لندن: پینگوئن بکس، ۱۹۵۵ء)، ۳۵۔

۱۱۔ اگلی سطور میں جو کچھ لکھا رہا ہے اس میں دیگر، الگ سے مذکور ہونے والے، ماخذات کے ساتھ ساتھ ٹی ایس ایلیٹ کے اس مقدمے سے خاص استفادہ کیا گیا ہے۔

۱۲۔ مزید تفصیل کے لیے درج ذیل کتاب دیکھیے جو *Pensées* ہی کا ایک آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے:

پال سی کیگان[Paul, C Kegan]، *The Thoughts of Blaise Pascal,* مترجم: ایم اگسٹ مولینیئر[M. Auguste Molinier](لندن: جارج بیل اینڈ سنز، ۱۹۷۶ء)، ۵-۸۔

۱۳۔ ٹی ایس ایلیٹ[T.S Eliot]، “The Pansees of Pascal”، مشمولہ *Selected Essays* (لندن: فیبر اینڈ فیبر لمیٹڈ، ۱۹۷۶ء)، ۴۰۹-۴۱۰۔

۱۴۔ ڈیسمنڈ کلارک[Desmond Clarke]، “Blaise Pascal”، مشمولہ *The Stanford Encyclopedia of Philosophy* ، https://plato.stanford.edu/archives/fall2015/entries/pascal/ (۲۹ جنوری، ۲۰۲۲ء)۔

۱۵۔ ٹی ایس ایلیٹ[T.S Eliot]، “The Pansees of Pascal”، ۴۱۴-۴۱۵۔

۱۶۔ پاسکل، *Pensées*، سیکشن ۱، “Thoughts on Mind and on Style”

اس مبحث کی تفہیم کے لیے خواطر کی اصل عبارتوں کے ساتھ ساتھ پاسکل کی فکر پر Michael Moriarty کی کتاب *Pascal Reasoning and Belief* سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

مائیکل موریارٹی[Michael Moriatry]، *Pascal Reasoning and Belief* (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۲۰ء)، ۴۴۔

۱۷۔ بلیز پاسکل[Blaise Pascal]، *The Provisdional Letters of Blaise Pascal* مترجم: تھامس ایم کری، ہرڈ اینڈ ہوگھٹن (نیویارک: بروم اسٹریٹ ۴۵۹، ۱۸۶۶ء)، ۴۴۸-۴۴۹۔

۱۸۔ ٹی ایس ایلیٹ[T.S Eliot]،"The Pansees of Pascal"،۴۰۲۔

۱۹۔ اصل انگریزی اقتباس:

"I cannot forgive Descartes. In all his philosophy he would have been quite willing to dispense with God. but he had to make Him give a fillip to set the world in motion; beyond this, he has no further need of God."

بلیز پاسکل[Blaise Pascal]،*Pensées*، پیرا گراف ۷۶-۷۷۔

ایک اور نسخے میں یہ مفہوم اس طرح ادا کیا گیا ہے:

"I cannot forgive Descartes. In his whole philosophy he would like to dispense with God, but he could not help allowing Him a flick of the fingers to set the world in motion, after which he had no more use for God."

۲۰۔ ایس۔ای فروسٹ[S.E Frost]،*The Basic Teachings of the Great Philosophers*(نیویارک: پرماجیانٹس، ۱۹۴۲ء)، ۱۳۲۔

۲۱۔ بلیز پاسکل[Blaise Pascal]،*Pensées*، پیرا گراف ۸۰۔

۲۲۔ بلیز پاسکل[Blaise Pascal]،*Pensées*، پیرا گراف ۳۴۶۔

۲۳۔ ژاں پال سارترے[Jean Paul Sartre]،"Existentialism is Humanism"، مشمولہ *Existentialism from Dostoevsky to Sartre* والٹر کافمن[Walter Kaufmann] (نیویارک: میریڈین بکس، ۱۹۵۷ء)، ۲۸۹-۲۹۰۔

۲۴۔ اصل انگریزی اقتباس:

"Man is condemned to be free; because once thrown into the world, he is responsible for everything he does."

ژاں پال سارترے [Jean Paul Sartre]، "Existentialism is Humanism"، مشمولہ *Existentialism from Dostoevsky to Sartre* والٹر کافمن[Walter Kaufmann] (نیویارک: میریڈین بکس، ۱۹۵۷ء)، ۲۹۵۔

۲۵۔ اصل انگریزی اقتباس:

"This world I can touch and I likewise judge that it exists. There ends all my knowledge, and the rest is construction. For if I try to seize this self of which I feel sure, if I try to define and to summarize it, it is nothing but water slipping through my fingers."

البرٹ کامیو[Albert Camus]،*The Myth Of Sisyphus And Other Essays*، ۲۴۔

۲۶۔ البرٹ کامیو[Albert Camus]،*The Myth Of Sisyphus And Other Essays*، ۱۰۸۔

۲۷۔ البرٹ کامیو[Albert Camus]،*The Myth Of Sisyphus And Other Essays*، ۲۲-۲۳، ۳۲، ۱۱۔

۲۸۔ ملاحظہ ہوں عسکری کے مضامین، مشمولہ تخلیقی عمل اور اسلوب اور مقالاتِ محمد حسن عسکری۔

محمد حسن عسکری، تخلیقی عمل اور اسلوب (مرتبہ) محمد سہیل عمر، (کراچی: نفیس اکیڈمی، ۱۹۸۹ء)۔

محمد حسن عسکری، مقالات محمد حسن عسکری، جلد ۱، ۲ (مرتبہ) شیما مجید (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء)۔

۲۹۔ ایڈورڈ ڈبلیو سید[Edward W Said]،*Culture and Imperialism* (لندن: ونٹیج بکس، ۱۹۹۴ء)، ۲۰۸-۲۱۱۔

ایڈورڈ ڈبلیو سید[Edward W Said]،*Culture and Imperialism* (پینگوئین بکس، ۲۰۰۳ء)، ۳۱۲-۳۱۴۔

فرانز فینون (۱۹۲۵ء-۱۹۶۱ء) اور ایڈورڈ سعید کی تحریروں سے اگرچہ مابعد نو آبادیاتی مطالعہ کا آغاز مانا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اردو کے نقاد محمد حسن عسکری نے ان سے کہیں پہلے اپنی تحریروں میں پس نو آبادیاتی مطالعات کی بنیاد رکھ دی تھی۔

۳۰۔ اصل انگریزی اقباس:

“The heart has its reasons, which reason does not know. We feel it in a thousand things. I say that the heart naturally loves the Universal Being, and also itself naturally, according as it gives itself to them; and it hardens itself against one or the other at its will. You have rejected the one and kept the other. Is it by reason that you love yourself?

It is the heart which experiences God, and not the reason. This, then, is faith: God felt by the heart, not by the reason.

We know truth, not only by the reason, but also by the heart, and it is in this last way that we know first principles; and reason, which has no part in it, tries in vain to impugn them. The sceptics, who have only this for their object, labour to no purpose.”

بلیز پاسکل[Blaise Pascal]، *Pensées*، پیراگراف، ۲۸۲، ۲۷۸، ۲۷۷۔

۳۱۔ اصل انگریزی اقباس:

“It was intelligence and nothing else that had to be opposed. Presumably that is why I, who had the job, was armed with an immense intelligence.”

ولیم بیرٹ[William Barrett]، *Irrational man*، ۱۴۹۔

۳۲۔ ولیم بیرٹ[William Barrett]، *Irrational man*، ۱۴۹۔

۳۳۔ اصل انگریزی اقباس:

“The last proceeding of reason is to recognise that there is an infinity of things which are beyond it. It is but feeble if it does not see so far as to know this. But if natural things are beyond it, what will be said of supernatural?”

بلیز پاسکل[Blaise Pascal]، *Pensées*، پیراگراف، ۲۶۷۔

۳۴۔ محمد حسن عسکری، تبصرہ براجنبی (از کامیو ترجمہ افضل اقبال)، مشمولہ مقالات محمد حسن عسکری، جلد ۱ (مرتبہ) شیما مجید (لاہور: علم و عرفان پبلشرز، ۲۰۰۱ء)، ۵۸۲۔

۳۵۔ اصل انگریزی اقباس:

“God of Abraham, God of Isaac, God of Jacob not of the philosophers and of the learned.”

ولیم بیرٹ[William Barrett]، *Irrational man*، ۱۰۲۔

۳۶۔ اصل انگریزی اقباس:

“If we submit everything to reason, our religion will have no mysterious and supernatural element. If we offend the principles of reason, our religion will be absurd and ridiculous.”

بلیز پاسکل[Blaise Pascal]، *Pensées*، پیراگراف، ۲۷۳۔

۳۷۔ ژاں پال سارترے[Jean Paul Sartre]، “Existentialism is Humanism”، ۲۸۹۔

۳۸۔ اصل انگریزی اقباس:

“Submission. – We must know where to doubt, where to feel certain, where to submit. He who does not do so understands not the force of reason.

There are some who offend against these three rules, either by affirming everything as demonstrative, from want of knowing what demonstration is; or by doubting everything, from want of knowing where to submit; or by submitting in everything, from want of knowing where they must judge.”

بلیز پاسکل[Blaise Pascal]، *Pensées*، پیراگراف ۲۶۸۔

۳۹۔ دیوان حافظ (مترجم)، ترجمہ قاضی سجاد حسین (لاہور: حامد اینڈ کمپنی، س ن)، ۹۲۔

Bibliography

Barrett, William. *Irrational Man*. New York: Doubleday Anchor Books,1958.

Camus, Albert. *The Myth of Sisyphus and Other Essays.* Translated by Justin O’Brien. London: Penguin Books, 1955.

Clarke, Desmond. “Blaise Pascal”. *The Stanford Encyclopedia of Philosophy,* https://plato.stanford.edu/archives/fall2015/entries/pascal/. Accessed Jan 29, 2022.

Eliot, T.S."The *Pensées* of Pascal" In *Selected Essays*. London: Faber and Faber Limited, 1976.

Frost, S.E. *The Basic Teachings of the Great Philosophers*. New York: Perma Giants, 1942.

Moriarty, Michael. *Pascal Reasoning and Belief*. Oxford: Oxford University Press, 2020.

Pascal, Blaise. “Pensées work by Pascal”. Jan 29, 2022. https://www.britannica.com/topic/*Pensees* Accessed May 31, 2022.

Pascal, Blaise. *Pensées*. New York: E. P. Dutton & Co. Inc., 1958.

Pascal, Blaise. *The Provincial Letters.* Translated by Rev. Thomas M'crie, Hurd, and Houghton. New York: 459 Broome Street, 1866.

Paul, C Kegan. *The Thoughts of Blaise Pascal*. Translated from the Text of M. Auguste Molinier. London: George Bell and Sons, 1901.

Said, Edward W. *Culture and Imperialism*. London: Vintage Books, 1994.

Said, Edward W. *Orientalism*. London: Penguin Books, 2003.

Sartre, Jean-Paul. "Existentialism is Humanism", In Kaufmann, Walter. *Existentialism from Dostoevsky to Sartre*. New York: Meridian Books, Inc., 1957.